سلسلہ مباحث

اسلامی ریاست

غیر مسلموں کے حقوق

(قسط دوم)

مولانا امین احسن اصلاحی

ذمیوں[1] یعنی اہل العنوہ کے حقوق

اب میں ذمیوں کے شرعی (اسلامی حکومت کے اندر ان کے دستوری) حقوق سے بحث کروں گا۔ لیکن ان حقوق کی اصل قدر و قیمت اور ان کی صحیح سپرٹ اور اہمیت سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ حسب ذیل چار باتیں پیش نظر رکھی جائیں:۔

(۱) یہ حقوق اسلام میں اُن لوگوں کے ہیں جن کو ہمارے اہل فقہ اپنی اصطلاح میں اہل عنوہ کہتے ہیں یعنی جنہوں نے خدا اور اس کے رسول سے جنگ کی اور پھر "اسلام" کی تلوار سے شکست کھا کر اسلامی حکومت[2] کی اطاعت کرنے پر مجبور ہوئے۔

[1] جیسا کہ ابتدا میں بھی یہ بات واضح کی جا چکی ہے اس مضمون میں "ذمیوں" سے مراد غیر مسلم رعایا کا یہی گروہ لیا گیا ہے۔

[2] "مسلمانوں کی حکومت" اور "اسلامی حکومت" کے فرق، اور "خدا اور رسول کو اپنے معاملات میں آخری سند نہ ماننے والی کسی مسلمان قوم کی اپنی دنیوی منفعتوں کے لئے جنگ" اور "اسلامی جہاد" کے فرق کو نمایاں طور پر ذہن میں موجود رہنا چاہئے، کیونکہ مسلمانوں کی وہ حکومت جو اسلام پر قائم نہ ہو اور مسلمان قوم جو اپنے معاملات میں خدا اور رسول کے سوا کسی اور سے سند لیتی ہو، یہاں اس کے معاملات زیر بحث نہیں ہیں۔

(۲) جو حقوق یہاں بیان کئے جا رہے ہیں ان کی حیثیت دنیا کے عام دستوری تحفظات کی سی نہیں ہے[1] بلکہ یہ سارے حقوق اسلامی شریعت کے اسی طرح اجزاء (Part and Parcel) ہیں جس طرح خدا اور رسول کے عاید کردہ دوسرے فرائض اور واجبات - اس لئے ان کا بہر شکل اور بہر حال قائم رکھنا اسلامی حکومت کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح شریعت کے دوسرے احکام و واجبات کا - اگر ان میں سے کسی حق کو بھی، بغیر کسی واقعی عذر کے، ضائع کیا گیا تو اسلامی ریاست صرف اس زمین ہی پر اس کے لئے جواب دہ نہیں ہے بلکہ اس کے بعد اس کی اصل جوابدہی خدا کے سامنے ہے اور وہاں اس مقدمہ میں مظلوم اہل ذمہ کے وکیل، جیسا کہ احادیث میں تصریح ہے، خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔

(۳) ذمیوں کو یہ حقوق مسلمانوں یا ان کی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اور ان کی ضمانت پر دیئے جاتے ہیں، ان کی ادائیگی میں دانستہ اور بلا عذر کوتاہی خدا اور رسول سے خیانت، اور غداری ہوگی۔

(۴) ذمیوں کے یہ حقوق کم سے کم ہیں۔ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے عطا کئے جانے کی وجہ سے ان میں خود اسی کمی کرنے کا بھی کسی اسلامی حکومت کو حق نہیں ہے۔ ان سے زیادہ وہ جو چاہے دے مگر ان میں سے کوئی حق کم کرنے کی وہ مجاز نہیں ہے۔

جو لوگ اسلامی حکومت کے اندر عام اہل ذمہ اور معاہد غیر مسلم رعایا کی الگ الگ قانونی حیثیت اور ان کے حقوق کے بنیادی فرق کو نہیں سمجھتے اور مذکورہ بالا باتوں کو بھی ان کی صحیح سپرٹ اور پوری وسعت کے ساتھ پیش نظر نہیں رکھتے وہ جب قرآن مجید میں یہ پڑھتے ہیں: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (وہ عاجزانہ حاضر ہو کر جزیہ ادا کریں)، یا وہ حدیثیں ان کی نظر سے

---

[1] کیونکہ ایسے تحفظات میں سے اکثر کی اوّل تو کتاب دستور کی زینت ہونے سے زیادہ کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو اسی وقت تک اور اسی حد تک جب تک اور جس حد تک حکومت کی حکمت عملی اور اغراض کے لئے ضروری یا مفید ہو۔

گذرتی ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے فاتحین کے بالمقابل اپنے مفتوحین کی مفتوحیت کو نمایاں رکھنا چاہا ہے۔ تو وہ ان باتوں سے غیر مسلموں کے آگے ایک شرمندگی سی محسوس کرتے ہیں اور پھر جب یہی احساس شرمندگی لئے ہوئے اِن مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں تو یا تو مسئلہ کے ضروری پہلوؤں کو سرے سے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یا پھر ان کی ایسی فضول قسم کی تاویلیں کرتے ہیں کہ ان سے غیر مسلموں کے شبہات تو کیا دور ہوں گے الٹے عام مسلمان بھی شکوک اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر غیر مسلم رعایا کے اِن دونوں گروہوں اور ان کے سیاسی مرتبہ کے قانونی اور بنیادی فرق اور پھر ذمیوں کے حقوق کی مذکورہ نوعیت کو ملحوظ رکھا جائے تو اس شرمندگی کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسلام نے اپنے مفتوحین کو جو حقوق دیئے ہیں اور جن ضمانتوں کے ساتھ دیئے ہیں اور پھر اسلام کے پابند مسلمانوں نے جس سپرٹ اور جس دیانت و امانت کے ساتھ ان کو ادا کیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی چہ جائیکہ اس پر کوئی اعتراض کیا جا سکے۔ یہاں سوال کاغذی اور کتابی حقوق کا نہیں ہے بلکہ سوال ان حقوق کا ہے جو مفتوح دشمن کو فی الواقع دیئے گئے ہیں، اور صرف کاغذ کے صفحات پر نہیں بلکہ صفحۂ ارض پر دیئے گئے ہیں۔

اس مختصر تمہیدی تشریح کے بعد، اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ، ان کم سے کم حقوق اور فرائض کی تفصیل پیش کرتے ہیں جو اسلامی شریعت نے ذمیوں کو دیئے ہیں یا ان پر عائد کئے ہیں۔

زمین اور خراج ذمی اپنی زمینوں کے مالک تو نہیں رہیں گے لیکن انہیں انکی زمینوں سے بیدخل بھی نہیں کیا جائیگا

---

[1] اس معاملہ کا فیصلہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہو گیا کہ مفتوحین کی زمینیں فاتحین میں تقسیم نہیں کی جائیں گی بلکہ وہ بدستور مفتوحین کے قبضہ میں رہیں گی اور حکومت ان سے خراج وصول کرے گی۔ جب کچھ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مفتوحین کی زمینیں مال غنیمت کی طرح تقسیم کی جائیں تو روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: انها عين المال (زمین کی حیثیت مستقل جائداد، Real Property - کی ہے)۔ یہ فوج میں تقسیم نہیں ہوگی۔ دشمن سے حاصل شدہ چیزوں میں سے صرف وہ چیزیں فوج میں تقسیم ہوں گی جو ذاتی املاک (Personal i.e movable property) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اپنی جگہ پر آئیگی۔

اس قبضہ کی نوعیت موروثی (Hereditary) ہوگی یعنی یہ قبضہ نسلاً بعد نسل ان کے ورثاء کو منتقل ہوگا۔ اس زمین سے متعلق آپس میں "وہ بیع، رہن اور ہبہ کے معاملات بھی کرسکیں گے[1]۔ اور حکومت ان زمینوں سے اپنے حقوق مالکانہ ایک مناسب شرحِ خراج کی صورت میں وصول کرے گی۔

خراج کی تشخیص میں اس امر کا لحاظ رکھا جائیگا کہ تشخیص کردہ خراج کا بار زمین آسانی سے اٹھا سکے۔ اور کسانوں کی واقعی ضروریات سے جو رقم فاضل بچے خراج کی زد صرف اس پر پڑے (انما امرنا ان ناخذ منھم العفو)۔ عراق کی زمینوں کی پیمائش اور ان کے خراج کی تشخیص کے لئے حضرت عمرؓ نے جن لوگوں کو متعین کیا تھا جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر واپس آئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے اس امر کی پوری تحقیق کی کہ "اتنا خراج تو نہیں لگا دیا ہے۔ کہ زمین اس کا تحمل ہی نہ کرسکے؟" جب ان لوگوں نے اطمینان دلایا اور تحقیق سے یقین ہوگیا کہ زمین کی پیداوار میں ذمیوں کے لئے کافی گنجائش چھوڑی گئی ہے[2]۔ اور تشخیص میں کسانوں کی واقعی ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ تو حضرت عمر کو اطمینان ہوا۔ اور انہوں نے اس تشخیص کی منظوری دی۔

نیز یہ خراج صرف اُن زرعی اور زیر کاشت زمینوں پر ہی لگایا جاتا ہے۔ جن سے کسان کو آمدنی ہوتی ہو۔ ذمیوں کے مکانات اور ان کے رہائشی مصرف کی دوسری زمینیں خراج سے مستثنیٰ ہیں[3]۔ خراج کی وصولی میں ذمیوں کے پہننے کے کپڑے، گھر کے برتن، خوراک کی مد کا غلہ، ہل، بیل اور دوسرے آلات کشاورزی نہ قبضہ میں لئے جاسکتے ہیں اور نہ قرق کئے جاسکتے[4]۔

حضرت علیؓ نے ایک شخص کو عکبری کا تحصیلدار مقرر کیا۔ ذمیوں کے روبرو تو اس کو یہ ہدایت فرمائی کہ دیکھو، جزیہ و خراج کی وصولی میں ان لوگوں سے ایک پیسہ بھی رعایت نہ کرنا۔ لیکن تنہائی میں

---

[1] کتاب الاموال ابو عبید۔ صفحہ ۸۴

[2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف۔ صفحہ ۲۱

[3] کتاب الاموال ابو عبید۔ صفحہ ۷۲

[4] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف، صفحہ ۹

بلا کر اس سے کہا کہ لوگوں کے سامنے میں نے جو بات کہی ہے وہ تو تم نے سن لی، اب ایک بات اور کہتا ہوں اور یاد رکھو، اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو معزول کر دوں گا۔ وہ یہ کہ خراج وصول کرنے کے لئے نہ کسی کا گدھا بیچنا، نہ اس کا بیل اور نہ اس کے سردی اور گرمی کے کپڑے۔ ان کے ساتھ نرمی کرنا، پھر نرمی کرنا، پھر نرمی کرنا۔[1]

خراج وصول کرنے کے لئے نہ کسی کو کوڑے مارے جائیں گے، نہ اس کو کھڑا رکھا جائے گا اور نہ اس کا ضروری سامان قرق کیا جائیگا۔[2] اس میں زیادہ سے زیادہ مہلت جو دینی ممکن ہے۔ وہ ان کو دی جائیگی۔ سعید بن عامر شام میں کسی مقام کے تحصیلدار تھے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ ان پر برہم ہوئے کہ خراج کی وصولی میں دیر کیوں ہوتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے حکم دیا ہے کہ کسانوں سے (ایک وقت میں) چار چار دینار سے زیادہ نہ وصول کیا جائے۔ ہم یہ تو کرتے ہی ہیں۔ لیکن اتنا مزید کرتے ہیں کہ فصل کی تیاری تک ان کو مہلت دے دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ان کا یہ جواب سنکر اس قدر خوش ہوئے کہ فرمایا، جب تک میں زندہ ہوں تم کو اس منصب سے معزول نہیں کرونگا۔[3] رعایا کو ظلم سے محفوظ رکھنے کے لئے حضرت عمرؓ یہ بھی کرتے تھے کہ جب عراق کا خراج آتا تو کوفہ اور بصرہ کے ذمہ دار لوگوں کو بلا کر ان سے قسمیں لیتے کہ اس مال کا کوئی حصہ کسی غیر مسلم پر زیادتی کر کے تو نہیں حاصل کیا گیا ہے؟[4]

یہی نہیں بلکہ جو لوگ خراج کی تحصیل پر مقرر کئے جاتے، خوب اچھی طرح جانچ کر مقرر کئے جاتے۔ حضرت عمرؓ کو اس کام کے لئے آدمیوں کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے کوفہ، بصرہ اور شام کے لوگوں کو لکھا کہ اپنے اندر سے بہترین آدمیوں کے نام منتخب کر کے لکھو۔ لوگوں نے نام منتخب کر کے

[1] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۴

[2] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۲۰

[3] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۴

[4] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۶۵

بھیجے تو آپ نے ان لوگوں کو خراج کی وصولی پر مقرر کیا۔[1]

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیلداروں کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے[2]:۔

ایک یہ کہ وہ ذی علم اور فقیہ (قانون داں) ہوں۔

دوسرے یہ کہ وہ اہل الرائے سے مشورہ لے کر کام کرنے کے عادی ہوں، مطلق العنانی اور خودرائی کا رجحان نہ رکھتے ہوں۔

تیسرے یہ کہ دیانت دار ہوں۔ ان کی کوئی بددیانتی ظاہر نہ ہوئی ہو۔

چوتھے یہ کہ وہ کسی حق کی حفاظت اور کسی امانت کی ادائیگی میں خدا کے سوا اور کسی کی پرواہ کرنے والے نہ ہوں۔

اہل ذمہ کو ظلم و ناانصافی سے بچانے کے لئے حکومت خراج کی تحصیل کا انتظام براہ راست کرے گی یہ کام بیچ کے آدمیوں (نمبرداروں، انعام داروں، جاگیرداروں) سے ٹھیکہ پر نہیں لے گی۔ اور اگر خود اہل ذمہ کی خواہش پر بھی ایسا کرنے کی نوبت آئے گی تو حکومت کی طرف سے اس بات کی پوری نگرانی کی جائے گی کہ بیچ کے آدمیوں (middle-men) کو رعایا پر ظلم کرنے اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے[3]۔

جزیہ ذمیوں سے ان کے جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس وصول کیا جائیگا۔ جس کو جزیہ کہتے ہیں۔ یہ جزیہ صرف ایسے مردوں پر لگایا جائے گا۔ جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں اور بچے اس سے مستثنےٰ ہیں۔ اسی طرح بوڑھے، مسکین اور غریب اور وہ اندھے، لنگڑے اور اپاہج بھی مستثنےٰ ہیں جو مال نہیں رکھتے۔ نادار مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنےٰ کیا گیا ہے[4]۔ یہ ٹیکس اشخاص کی حیثیت کے لحاظ

۱؎ کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف۔ صفحہ ۶۲

۲؎ " " " ۶۰

۳؎ " " " ۶۰

۴؎ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف، صفحہ ۷۰

سے لگایا جائیگا۔ لیکن چونکہ اصول یہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ "لیس فی اموال اھل الذمہ الا العفو"[۱] یعنی اہل ذمہ کے مال میں حکومت کا حق وہی ہے جو ان کی ضروریات سے فاضل ہو، اس وجہ سے یہ ٹیکس ہمیشہ نہایت ہلکا لگایا گیا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں امیروں سے ایک روپیہ ماہوار، متوسطین سے آٹھ آنے ماہوار اور غربا سے چار آنے ماہوار کے حساب سے وصول کیا گیا ہے[۲]۔ اور اس پر بھی اگر کسی شخص کے بارہ میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ یہ رقم اس کے لئے زیادہ ہے تو اس میں بھی کمی کر دی گئی ہے[۳]۔

جزیہ کی وصولی کے لئے کسی شخص پر کوئی ناروا سختی یا جبر و ظلم نہیں کیا جائے گا۔ نہ اس کو دھوپ میں کھڑا کیا جائے گا، نہ کوئی اور جسمانی ایذا دی جائے گی بلکہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے گی[۴]۔ حضرت عمرؓ کے پاس ایک مرتبہ جزیہ کا مال زیادہ آگیا تو آپ نے تحصیلداروں سے فرمایا، میرا خیال ہے۔ کہ تم لوگوں نے خوب رعایا کو تباہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے قسمیں کھائیں کہ ہم نے بڑی نرمی اور درگذر کے ساتھ وصولی کی ہے۔ پوچھا، بغیر مارے باندھے؟ تحصیلداروں نے جواب دیا، ہاں اے امیر المؤمنین بغیر مارے باندھے۔ پورا اطمینان کرنے کے بعد فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ نہ میرے اپنے ہاتھوں اس طرح کا کوئی ظلم ہوتا ہے۔ اور نہ میری سلطنت میں کوئی ظلم ہوتا ہے[۵]۔

لوگوں کی آسانی کے لئے، خلفائے راشدین کے زمانہ میں، اہل صنعت سے جزیہ میں وہی چیزیں قبول کر لی گئی ہیں جو وہ تیار کرتے تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ سوئیاں تیار کرنے والوں سے سوئیاں، کنگھیاں بنانے والوں سے کنگھیاں، رسیاں بٹنے والوں سے رسیاں ہی جزیہ میں قبول کر لیتے تھے تاکہ لوگوں کو آسانی

۱۔ کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۷۰

۲۔ کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۰

۳۔ کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۱

۴۔ کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۷۰

۵۔ کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۳

میں کوئی زحمت نہ ہو۔[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں حکم جاری کیا کہ اگر کوئی شخص مرگیا یا بھاگ گیا تو اس کے ذمہ جزیہ کی جو رقم واجب الادا تھی، وہ اس کے وارثوں سے نہیں وصول کی جائے گی۔[2]

جزیہ چونکہ حفاظت جان و مال کا ٹیکس ہے۔ اس وجہ سے جب کبھی ایسا ہوا ہے کہ مسلمان یہ ذمہ داری لینے کے بعد اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں تو انہوں نے جزیہ واپس کر دیا ہے۔ حضرت ابو عبیدہ کی گورنری کے زمانہ میں شام کے بعض مقامات پر رومیوں کی ایسی یورش ہوئی کہ مسلمانوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ حضرت ابو عبیدہ نے ذمیوں کا جزیہ واپس کر دیا۔ اس پر ذمیوں نے دعا کی کہ خدا تم کو رومیوں پر غالب کرے اور پھر واپس لائے۔ اگر رومی تمہاری حیثیت میں ہوتے تو کوئی چیز واپس کرنا تو الگ رہا، جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ بھی لوٹ کے لے جاتے۔[3]

ذمی چونکہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اس وجہ سے اگر ذمیوں نے اپنی مرضی سے کوئی فوجی خدمت انجام دی ہے یا ان سے کوئی فوجی خدمت لی گئی ہے تو اس دوران میں وہ جزیہ سے مستثنیٰ رکھے گئے ہیں۔ نیز اگر کسی ذمی نے اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت سے ریاست کو کوئی نمایاں فائدہ پہنچایا ہے تو وہ جزیہ سے مستقلاً بری کر دیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں قاہرہ سے بحر احمر تک جو نہر نکالی گئی اس کے نقشہ کی تیاری میں جس ذمی نے مدد دی تھی اس کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔[4]

اہل ذمہ کا حق بیت المال میں جو اہل ذمہ اپنے معاش کے حصول سے عاجز ہو جائیں گے۔ ان کے لئے ان کی ضرورت کے موافق اسلامی بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن

---

۱ کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۷۵

۲ " " " ۴۹

۳ کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۸۱

۴ ان دونوں باتوں کا ذکر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب دی مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ کے صفحہ ۱۰۱ پر کیا ہے اور طبری اور سیوطی کی حسن المحاضرہ کا حوالہ دیا ہے۔

عبدالعزیز نے اپنے عامل عدی بن ارطات کو حکم بھیجا کہ "تمہارے حلقہ میں جو اہل ذمہ ہیں ان کے حالات معلوم کرو، جو بوڑھے ہو چکے ہوں اور کمانے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں ان کے لئے ان کی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفے جاری کر دو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ امیر المومنین عمر فاروق نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا جو دروازہ دروازہ بھیک مانگ رہا تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا ہم نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا، اگر جوانی میں تم سے جزیہ وصول کیا اور بڑھاپے میں تمہیں نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ جاری کر دیا"۔[۱]

اہل حیرہ کے لئے حضرت خالدؓ نے یہ ذمہ لیا تھا کہ تم میں سے جو بوڑھا ہو جائیگا یا جس پر کوئی آفت آجائے گی یا جو شخص مالدار رہنے کے بعد غریب ہو جائے گا، وہ جب تک دارالاسلام میں رہے گا اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت بیت المال کرے گا۔[۲]

اگر کوئی ذمی دشمن کے قبضہ میں آجائے اور اس کو فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فدیہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا۔[۳]

اہل ذمہ کی جان کی حفاظت | چونکہ جزیہ کے بدلہ میں اسلامی حکومت اہل ذمہ کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لے لیتی ہے[۴]، اس وجہ سے جس طرح وہ ایک مسلمان کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہے اسی طرح ایک ذمی کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی طرح قانون کی نظر میں ایک مسلم اور ایک ذمی کی جان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شعبی نخعی، امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ایک ذمی کے قصاص میں ایک مسلم قتل کیا جائے گا۔[۵] طبرانی نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک

---

[۱] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۴۶

[۲] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۸۵

[۳] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۲۷

[۴] لان دمائهم و اموالهم انما احرزت باداء الجزية (اسلئے کہ جزیہ ادا کرنے کے بعد ان کے جان و مال محفوظ ہو جاتے ہیں)۔ کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۷۰۔

[۵] نیل الاوطار۔ جلد ۷، صفحہ ۸

مسلمان لایا گیا۔ جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تھا۔ تحقیق سے اس پر الزام ثابت ہو گیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ بعد میں مقتول کے بھائی نے آکر کہا کہ میں نے قاتل کو معاف کر دیا۔ حضرت علی نے فرمایا، شاید لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے! اس نے کہا، امیر المومنین، یہ بات نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل کے قتل ہونے سے میرا بھائی تو ملنے سے رہا اور ان لوگوں نے مجھے کچھ پیشکش کی ہے جو میں نے قبول کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا اس بات کا تم کو اختیار ہے، ورنہ ہم نے جن لوگوں کا ذمہ لیا ہے۔ ان کا خون ہمارے خون کے برابر ہے۔ اور ان کی دیت (خون بہا) ہماری دیت کے برابر ہے

احادیث میں ذمی کے قتل کے بارہ میں بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں:۔

"عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت کی دوری سے محسوس ہوگی"۔ (احمد، بخاری، النسائی، ابن ماجہ)۔

"ابوہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی ذمی کو، جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ لیا گیا ہے، قتل کیا اس نے اللہ کے ذمہ کو توڑا اور وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی دوری سے سونگھی جائے گی"۔ (ابن ماجہ، ترمذی)

اسی طرح ذمی کی دیت کے بارہ میں امام ثوری، امام زہری، زید بن علی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک ذمی کے خون بہا میں بصورتِ قتل عمد کوئی فرق نہیں ہے۔

عمرو بن امیہ ضمری نے دو عامریوں کو، جن کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد تھا، نادانستہ طور پر قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وہی دیت دلوائی جو مسلمانوں کی دیت تھی۔

بیہقی نے زہری سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہودی اور نصرانی کی دیت مسلمانوں کی دیت کے برابر تھی اور یہی صورتِ حال حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت

عثمان کے زمانوں میں رہی۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ذمی کی دیت وہی ادا کی جو ایک مسلمان کی دیت ہوتی ہے[۲]۔

اس انفرادی حفاظت کے علاوہ اگر کوئی دشمن اہل ذمہ پر حملہ آور ہوگا تو اسلامی حکومت ان کی حفاظت کے لیے جنگ کرے گی۔ (وان یقاتل من ورائھم[۲]۔ اور یہ کہ ان کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے گی۔)

اہل ذمہ کے مال کا احترام | اہل ذمہ کی جان کی طرح ان کا مال بھی اسلامی حکومت میں محترم (Inviolable) ہے۔

"صعصعہ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ ہم لوگ جب اہل ذمہ کی بستیوں سے گذرتے ہیں تو اُن کی چیزوں میں سے کبھی کوئی چیز لے لیتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا، بلاقیمت؟ میں نے عرض کیا، ہاں، بلاقیمت۔ ابن عباس نے فرمایا، آخر تم لوگ اس بارہ میں کہتے کیا ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہم کہتے ہیں۔ کہ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ (یعنی معمولی بات ہے)۔ انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ وہی بات کہتے ہو جو اہل کتاب کہتے ہیں کہ لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی اللہ الکذب وھم یعلمون۔ (ہمارے لیے امیوں۔ غیر اہل کتاب۔ کا مال کھا جانے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اور وہ اللہ پر جان بوجھ کر بہتان لگاتے ہیں)[۳]"

"ابو عبداللہ یا ابو عبدالرحمن راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں سعد کے ساتھ تھا۔ رات راستہ میں گذارنی پڑی۔ پاس ایک ذمی کا مکان تھا۔ ہم نے اس کے مالک کو دریافت کیا لیکن وہ

[۱] یہ ساری تفصیل نیل الاوطار باب دیۃ المعاہد، جلد ۷، صفحہ ۵۵ سے لی گئی ہے۔

[۲] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۲۱

[۳] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۴۹۔

گھر پر موجود نہ تھا۔ سعد نے کہا، اگر کل کو خدا سے ایمان کے ساتھ ملنے کی آرزو رکھتے ہو۔ تو خبردار اس کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ چنانچہ ہم نے اس کی دیوار کے نیچے بھوکے رات گذاری[۵]"

حضرت ابوالدرداؓ کا حال یہ تھا کہ اگر اہل ذمہ کی کسی بستی سے ان کا گذر ہوتا تو زیادہ سے زیادہ جو فائدہ وہ ان سے اٹھاتے وہ صرف یہ کہ ان لوگوں کے کنویں سے پانی پی لیں، ان کے سایہ میں سستالیں اور ان کی چراگاہ میں اپنے گھوڑے کو چرالیں اور پھر اس کا بھی نقد یا جنس کی صورت میں ان کو معاوضہ دیتے[۱]

عُبادہ بن صامتؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے ذمیوں کی کسی بستی میں اپنے غلام کو مسواک کے لئے بھیجا لیکن پھر واپس بلا لیا اور کہا جانے دو، آج اس کی کوئی قیمت نہ سہی لیکن کل خشک ہو کر اس کی بھی قیمت ہو گی[۲]

حضرت عمرؓ جابیہ میں تھے۔ ایک ذمی نے آکر ان کو خبر دی کہ لوگوں نے اس کا انگوروں کا باغ تباہ کر ڈالا۔ حضرت عمرؓ خود تحقیق کے لئے بڑھے۔ دیکھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ڈھال میں انگور لئے چلے جا رہے ہیں۔ فرمایا، اچھا، آپ بھی ہیں! انہوں نے جواب دیا، امیر المؤمنین، بھوک نے ستایا تھا اس وجہ سے یہ حرکت ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے فوراً حکم دیا کہ باغ والے کو اس کے انگوروں کی قیمت ادا کر دی جائے[۳]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فوج کی زیادتیوں سے اہل ذمہ کے سامنے اپنی برأت کا اظہار کیا[۴]۔

چونکہ عموماً اہل ذمہ کی بستیاں دارالاسلام کے شہروں سے دور واقع تھیں اور ان میں

---

[۱] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۵۰

[۲] " " " ۱۵۰

[۳] " " " ۱۵۰

[۴] " " " ۱۵۱

[۵] " " " ۱۵۱

مسلمان آباد نہیں تھے اور نہ ابھی اُس زمانہ میں حالات نے اتنی ترقی کی تھی کہ سرکاری عمال اور دوسرے مسلمانوں کے ٹھیرنے کے لئے اُن علاقوں میں سرکاری طور پر کوئی انتظام ہو سکے اس وجہ سے اکثر مقامات کے ذمیوں سے یہ قرارداد ہو گئی تھی کہ جو مسلمان ان کی بستیوں میں آئیں گے چوبیس گھنٹے کے لئے ان کی میزبانی کا بار اہل ذمہ اٹھائیں گے۔ اگر بارش یا بیماری کی وجہ سے کسی کو اس سے زیادہ ٹھیرنا پڑے گا۔ تو وہ اپنے مصارف پر ٹھیرے گا۔ اور اس میزبانی کے سلسلہ میں پیٹ بھر روٹی اور اپنے مرکب کے چارہ کے سوا کسی اور شے کے مطالبہ کا حق کسی کو نہ ہوگا۔

انا جعلنا الضيافة على اهل السواد يوما وليلة وان حبسه مطر او مرض انفق من ماله ولا يتوى من طعام او علف۔	ہم نے اہل عراق پر صرف ایک دن رات کی ضیافت لازم قرار دی ہے۔ اور اس میں کھانے اور چارہ سے زیادہ کچھ لینے کا حق نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو بارش یا بیماری کی وجہ سے زیادہ دن رکنا پڑے تو وہ اپنے پاس سے خرچ کرے۔

اگرچہ کسی پہلو سے اس چیز کو ناجائز یا اہل ذمہ پر کوئی زیادتی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن اس بارہ میں بھی امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ ان سے کوئی چیز ان کی مرضی کے بغیر نہیں لی جا سکتی۔ پوچھا گیا، پھر یہ جو ان کے اوپر مسلمانوں کی میزبانی کا بار ڈالا گیا، یہ کیا تھا؟ فرمایا اس کے بدلہ میں ان کے جزیہ میں کمی کی جاتی تھی۔ امام صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

لا ینال منھم شیئ الا بطیب انفسھم۔ قیل فالضیافۃ التی کانت علیھم؟ فقال کان یخفف عنھم لھا۔

اہل ذمہ کے مذہبی حقوق | اہل ذمہ اپنے مذہبی فرائض و مراسم بجا لانے میں بالکل آزاد ہوں گے اس بارہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جن شہروں میں ان کے فتح ہونے کے بعد حکومت نے ذمیوں کے قیام کو منظور کر لیا ہے ان شہروں میں ان کے مذہبی حقوق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائیگی۔

لہ کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۴۹

ابو عبید نے بزورِ شمشیر فتح کئے ہوئے مقامات کی ایک لمبی فہرست دینے کے بعد لکھا ہے:۔

فھذا بلاد العنوۃ و قد اقر اھلھا فیھا علی مللھم و شرائعھم۔[1]

یہ سارے مقامات بزورِ شمشیر فتح ہوئے ہیں اور ان میں ان کے باشندوں کو ان کے مذہب و شریعت کی پوری آزادی کے ساتھ بسنے کی اجازت دی گئی۔

اس آزادی پر اگر کوئی پابندی ہے تو صرف ان شہروں میں ہے جن کو خاص طور پر مسلمانوں نے بسایا ہو یا جن کو فتح کرنے کے بعد ان کے سابق باشندوں کے حوالہ کرنے کے بجائے حکومت نے اپنے مقاصد کے لئے خاص کر لیا ہو۔[2]

ذمیوں کا پرسنل لاء اہل ذمہ کے پرسنل لا (Personal Law) میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت حسنؓ سے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ مجوس کے اپنی لڑکیوں اور سوتیلی ماؤں کے ساتھ نکاح کرنے کے معاملہ میں ہمارے پیشرو خلفاء نے کوئی مداخلت نہیں کی؟ حضرت حسن نے جواب دیا، آپ کو بہر حال اُنہی کے نقش قدم کی پیروی کرنی ہے، اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں کرنی ہے۔[3]

اسی ایک بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذمیوں کو ان کے مذہبی معاملات اور پرسنل لا میں کس حد تک آزادی دی جائے گی۔

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

ان اصولی باتوں کو بیان کرنے کے بعد اب میں بعض عام غلط فہمیوں کو صاف کرنے کی

---

[1] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۰۱

[2] " " " ۹۷

[3] " " " ۳۶

کوشش کرونگا جو ذمیوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے طرز عمل سے متعلق اس زمانہ میں عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں :-

(۱) ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کو اظہار رائے و خیال اور دینی و مذہبی تبلیغ کی اجازت نہیں ہوگی۔ اِس خیال کی کوئی اصل نہیں ہے۔ جہاں تک حکومت اس کے نظم ونسق، اس کی پالیسیوں اور اس کے کارکنوں کا تعلق ہے ان پر بحث وتنقید کے بارے میں تو خیر کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ مذہبی تبلیغ کے سلسلہ میں بھی اسلام نے غیر مسلموں پر اس قید کے سوا کوئی قید عاید نہیں کی ہے۔ کہ وہ فساد انگیزی اور دل آزاری سے پاک ہو اور یہ قید جس طرح مسلموں کے لئے ہے، اسی طرح مسلمانوں کے لئے بھی ہے۔ خدا کے نبیوں اور رسولوں کی توہین وتحقیر کی اجازت نہ مسلمانوں کو دی جائے گی نہ غیر مسلموں کو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں ایک عام اعلان یہ فرمایا تھا۔

من سب اللہ و رسولہ او سب احدا من الانبیاء فاقتلوہ۔ (زاد المعاد ج ۲) جو اللہ اور اس کے رسول یا نبیوں میں سے کسی نبی کو برا بھلا کہے اس کو قتل کر دو۔

جس طرح نبیوں اور رسولوں کی تحقیر وتوہین کی اجازت نہیں دی جائے گی اسی طرح انسانیت اور حق کے عام خدمت گذاروں کی توہین وتحقیر کی بھی کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی خواہ ان کا تعلق کسی قوم سے ہو۔ کیونکہ اسلام اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا کے ہادی ہر قوم میں آتے ہیں اگرچہ ان کی قوموں نے ان کی تعلیموں میں خرابیاں پیدا کر دیں۔

اس قید کے سوا دین کی تبلیغ میں کسی مذہب وملت کے لوگوں پر بھی کوئی قید نہیں ہوگی۔ البتہ اسلام نے مسلموں یا غیر مسلموں کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ اُن بنیادی اصولوں کی "مخالفت" یا "تحقیر" کریں جن پر اسلامی ریاست قائم ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی اجازت اس آسمان کے نیچے نہ کسی حکومت نے آج تک کسی کو دی ہے۔ اور نہ کوئی حکومت اس کی اجازت دے سکتی ہے۔ انگلستان کی حکومت اپنی رواداری اور مذہبی

غیر جانبداری کے لئے ضرب المثل بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے ملک کے اندر کسی شخص کو بھی یہ حق یا یہ اجازت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ تاج برطانیہ کی حاکمیت کو چیلنج یا اس کی مخالفت یا تحقیر کرے۔ کیونکہ اس چیز پر انگریزوں کی سلطنت کی بنیاد ہے۔ اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو اس کو کم سے کم غدر کبیر (High treason) کی سزا دی جائے گی۔ روس اور امریکہ میں ایسے جرم کے مرتکب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوگا۔ اپنی حفاظت خود اختیاری کے اسی حق کے تحت اسلامی حکومت بھی اپنی حدود کے اندر کسی شخص کو (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ خدا کی حاکمیت کے خلاف آواز اٹھائے یا اس کی تردید یا تحقیر کی کوشش کرے، کیونکہ یہ چیز براہ راست سلطنت کی ہستی پر حملہ ہے اور اس کی قانونی حیثیت بعینہ وہی ہے جو انگریزی راج کے دوران میں تعزیرات ہند کے تحت "بادشاہ کے خلاف جنگ" (Waging War Against the King) یا "ریاست کی ہستی پر حملہ" (Depreaation against the State) کے جرائم کی تھی۔ تاہم اس معاملہ میں بھی آج تک دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی روشن خیال اور زیادہ سے زیادہ شہری آزادی (Civil Liberties) کی دعویدار حکومت اسلام کی برابری نہیں کر سکی۔ اس زمین کی سطح پر کبھی کوئی ریاست (بجز صحیح اور سچی اسلامی ریاستوں کے) ایسی نہیں گذری اور نہ اس وقت موجود ہے جس نے اپنے حدود اقتدار کے اندر اپنے بنیادی اصولوں کے منکرین کے لئے پنپنے کی تو درکنار زندہ رہنے کی بھی گنجائش رکھی ہو۔ ہمارے پڑوس کے ملک میں کوئی شخص "دو قومی نظریہ" پر ایمان رکھ کر سانس نہیں لے سکتا۔ روس میں کمیونزم کے بنیادی اصولوں کے منکریں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اسلامی حکومت اپنے بنیادی اصولوں کے منکرین اور مخالفین کو نہ صرف یہ کہ اپنے دائرۂ اقتدار میں پناہ اور وہ سارے حقوق دیتی ہے جن کا ابھی اوپر ذکر گذرا ہے بلکہ انہیں اس بات کا بھی پورا حق دیتی ہے کہ جو عقاید و نظریات وہ رکھتے ہیں ان پر قائم رہیں، ان کو اپنے اخلاف میں بطور ورثہ منتقل کریں، اپنے دائرے کے اندر ان کی

حفاظت و ترقی کے لئے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بے روک ٹوک کریں۔۔ یہ ریاست ان کو اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ ان نظریات کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے برپا اور ان کو اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں پر بالفعل غالب کرنے کی کوشش کریں۔ غور کیجئے تو اس بارہ میں غیر مسلموں کو، اسلام نے مسلمانوں سے بھی زیادہ آزادی عطا کی ہے کیونکہ غیر مسلم تو اسلامی حکومت کے اندر اپنی پسند کے ہر دین و مذہب اور نظریہ و خیال کو اختیار کرنے کے لئے کاملاً آزاد ہیں مگر مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اسلامی مملکت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسلام کے سوا کسی اور نظریہ و خیال کو اعتقاداً بھی اختیار کریں۔

(۲)۔ دوسری عام غلط فہمی، جو اول الذکر سے کچھ کم اہم نہیں، یہ پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کی حیثیت بس محکومِ محض کی ہوتی ہے۔ نہ ان کے لئے کوئی احترام ہوتا ہے، نہ ان کی کوئی آواز ہوتی ہے اور نہ ان کو اسلامی حکومت کی ملازمتوں اور اس کے دوسرے کاموں میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ یہ بھی سراسر غلط فہمی ہی ہے۔ واقعات کی شہادت نہ صرف یہ کہ اس کی تائید نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور ان کو حکومت کے مختلف شعبوں میں اپنی قابلیت کے جوہر نمایاں کرنے کا موقع دیا ہے۔ اوپر یہ بات گذر چکی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر کی نہر کا نقشہ ایک غیر مسلم (انجینئر) نے تیار کیا تھا۔ حکومت کے عام شعبے تو الگ رہے، غیر مسلم اسلامی جہاد میں حصہ لیتے رہے ہیں اور مال غنیمت میں مسلمانوں کی طرح حصہ پاتے رہے ہیں[1] مثلاً:۔

فتوحات ایران کے سلسلہ میں ایک معرکہ کے دوران میں حضرت عمرؓ کے سپہ سالار فوج، مُثنّٰی بن حارثہ، نے مشہور عیسائی قبیلہ بنی تَغلِب کے دو آدمیوں، انس بن ہلال نمری اور ابن مردی الفہر التغلبی کو جو مذہباً عیسائی تھے، بلایا اور ان سے کہا، اگرچہ تم ہمارے دین پر

[1] نیل الاوطار، جلد ۸، صفحہ ۳۵

نہیں ہو لیکن بہر حال عرب (ہمارے ہم وطن) ہو اس وجہ سے تم دونوں میرے ساتھ رہنا اور جب میں ایرانی سپہ سالار مہرآن پر حملہ کروں تو میری مدد کرنا۔ چنانچہ مہرآن کو قتل کرنے والا نصرانی قبیلہ بنی تغلب ہی کا ایک نوجوان تھا۔ اس معرکہ میں مثنیٰ کے بھائی مسعود نے شہادت پائی اور اسی میں انس بن ہلال نمری بھی مارا گیا۔ معرکہ کے ختم ہونے پر مثنیٰ نے اپنے بھائی مسعود کی لاش کو بھی سینہ سے لگایا اور انس بن ہلال کی لاش کو بھی سینہ سے لگایا اور دونوں کا یکساں ماتم کیا۔[1]

مصر میں بنیامین قبطیوں کا ایک بڑا لیڈر تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ اس کو اپنی قوم کے اندر بڑا اعتماد حاصل ہے۔ تو انہوں نے عمرو بن عاص (گورنر مصر) کو لکھا کہ انتظام ملک میں اس سے مشورہ لیا جائے۔ چنانچہ عمرو بن عاص نے بنیامین کو قبطیوں کے سارے پرسنل لاء کا ذمہ دار بنا دیا۔[2]

اِن سے اور اس طرح کی دوسری شہادتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس باب میں اسلامی حکومت نے دو باتیں سامنے رکھی ہیں اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کو دنیا کی کوئی حکومت بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ایک یہ کہ غیر مسلم اپنے طرز عمل سے اپنے آپ کو اعتماد کے لائق ثابت کریں اور اسلامی حکومت کے ساتھ ان کی وفاداری ہر پہلو سے غیر مشتبہ ہو۔ جن غیر مسلموں نے اپنے آپ کو اعتماد کے لائق ثابت کیا اُن پر مجرد اس بات کی وجہ سے کہ وہ غیر مسلم ہیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتماد کرنے سے انکار فرمایا اور نہ خلفائے راشدین نے۔ بنی خزاعہ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ :-

وکانت خزاعة عیبة رسول الله صلی الله علیه وسلم مشرکھا ومسلمھا	قبیلہ بنی خزاعہ کے مشرک اور مسلم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد تھے۔

چنانچہ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے

---

[1] الفاروق عمر، تالیف محمد حسین ہیکل۔ صفحہ ۱۲۲، جلد ۲۔

[2] " " " " ۱۷۲، جلد ۲۔

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات نہایت اہم جنگی اور سیاسی فرائض ان لوگوں کے سپرد فرماتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر بنی خزاعہ کے مسلم اور غیر مسلم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر میں شریک تھے اور یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مکہ پر حملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درحقیقت انہی لوگوں کی مظلومیت کا بدلہ لینے کے لئے کیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ اسلامی حکومت چونکہ ایک اصولی حکومت (Ideological State) ہے اس وجہ سے وہ اپنی کلیدی اسامیاں جن کا تعلق "پالیسی کے تعین" - Initiation and Formation of Policy سے ہے، انہی لوگوں کے سپرد کرتی ہے جو ان اصولوں پر ایمان رکھتے ہوں جن پر اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی ہے جس طرح روس کی اشتراکی حکومت کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی وزارت خارجہ کا قلمدان کسی ایسے شخص کے سپرد کر دے جو اشتراکیت کا مخالف ہو یا اس پر ایمان نہ رکھتا ہو اسی طرح اسلامی حکومت کے لئے یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ اپنے کسی ایسے عہدے کو جس کا تعلق حکومت کی پالیسی کے تعین سے ہے کسی ایسے شخص کے حوالہ کر دے جو اسلام کا مخالف ہے یا اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت بھی، جو کسی خاص اصول اور نظریہ پر مبنی ہو، ایسا نہیں کر سکتی اور نہ اس سے یہ مطالبہ کرنا جائز اور صحیح ہو سکتا ہے[1]۔ اس حد سے باہر ایک مسلم اور غیر مسلم میں جو فرق بھی ہوگا وہ صرف قابلیت، حسن کارکردگی اور اعتماد کی بنا پر ہوگا، نہ کہ مجرد مسلم اور غیر مسلم ہونے کی بنا پر۔

(۳) تیسری غلط فہمی، جسے اسلام کے ہوشیار دشمنوں نے دانستہ اور اس کے نادان دوستوں نے اپنی بے خبری سے کافی پھیلایا ہے، یہ ہے کہ یہ بات اسلامی حکومت کی گویا پالیسی اور پروگرام کا ایک جزء ہے کہ وہ اپنے کاروبار اور معاملات میں ایسے طریقے اختیار کرے جن سے غیر مسلموں کی تحقیر و تذلیل ہو۔ ہر چند اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام نے فاتحین اور مفتوحین کے درمیان امتیاز رکھا ہے، لیکن یہ امتیاز نہ تو غیر مسلموں کی

[1] مگر ہمارے ملک میں ایسے بے باک جہلا کی کمی نہیں ہے جو علی الاعلان بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ غیر مسلم اسلامی حکومت کا صدر (امیر المومنین) تک بنا دیا جا سکتا ہے۔

تحقیر کی غرض سے ہے اور نہ فی الواقع اس میں تحقیر کا کوئی شائبہ شامل ہے۔ یہ امتیاز بالکل ویسا ہی ہے جیسا ہر اصولی جماعت اپنے ارکان اور غیر ارکان میں کرتی ہے اور کرنے پر مجبور ہے۔ جو معاشرہ بھی کسی عقیدے اور اصول پر قائم ہوگا اسے لازماً اپنے ارکان کو اس سے بچانا ہوگا۔ کہ وہ اس عقیدے اور اصول کے منکرین و مخالفین کے ساتھ گھل مل کر اس طرح یک جان ہو جائیں۔ کہ ان میں سرے سے کوئی فرق ہی باقی نہ رہ جائے۔

جن معاملات کی بنا پر لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلی ہے ان میں سے ہر معاملہ کے صحیح پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کے غلط پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض خاص خاص معاملات کی طرف اشارہ کر کے ان کے صحیح پہلو پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱۔ اس سلسلہ میں ایک مشہور بات یہ ہے کہ ذمیوں پر یہ بار ڈالا گیا تھا کہ ان کے شہروں میں جو مسلمان آئیں گے ان کی میزبانی اُن پر لازم ہوگی۔ اس میزبانی کی وجہ، جیسا کہ اس کی نوعیت اوپر مختصراً واضح کی جا چکی ہے، یہ تھی کہ اس زمانہ کے حالات کے تحت اس کے سوا کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں تھی۔ موجودہ زمانے میں جبکہ ہر علاقے میں حکومتوں کے اپنے ڈاک بنگلے موجود ہیں۔ ایسا کوئی بار کسی پر ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ذمیوں کو اس بات سے منع کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا سا لباس استعمال نہ کریں۔ اس حکم کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ذمی عام طور پر فوجی لباس پہننے لگ گئے تھے جس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی تھیں اور مزید غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس وجہ سے انتظامی طور پر اُن کو اس سے روکا گیا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے حیرہ کے ذمیوں سے جو شرط کی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

وَلَهُمْ كُلُّ مَا لَبِسُوا مِنَ الذِّيِّ إِلَّا زِيَّ الْحَرْبِ[1]۔	یہ لوگ فوجی لباس کے سوا ہر لباس اختیار کر سکتے ہیں۔

[1] کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، صفحہ ۸۵۔

ظاہر بات ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنے فوجیوں کی وردی کے عام استعمال کی لوگوں کو اجازت نہیں دیا کرتی، اس وجہ سے اگر اسلامی حکومت نے بھی اس قسم کا کوئی حکم دیا تو دنیا کے معروف اور مسلّم طریقوں کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ رہی یہ بات کہ اس چیز نے مسلم اور غیر مسلم کے لباس میں فرق کی صورت اختیار کرلی تو اس کی وجہ تھوڑے سے غور سے یہ سمجھ میں آتی ہے۔ کہ اُس زمانے میں چونکہ مسلمانوں کے سارے قابل جنگ آدمی بالعموم جہاد ہی میں مصروف رہتے تھے اس وجہ سے فوج عملاً تقریباً پوری قوم پر مشتمل تھی اور پھر کوئی باقاعدہ مستقل فوج (Standing Army) نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے عام اور معروف لباس ہی نے ان کی وردی کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ ایسی صورت میں غیر مسلموں کو یہ حکم دینا کہ وہ فوج کی وردی نہ استعمال کریں دوسرے لفظوں میں یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ مسلمانوں کا لباس نہ اختیار کریں معاملہ کی اصل صورت یہی معلوم ہوتی ہے لیکن بعد میں راویوں کی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ بات پھیل گئی کہ اسلامی حکومت ذمیوں کو مسلمانوں سے اپنا لباس مختلف رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔

۳۔ تیسری چیز یہ ہے کہ عام تجارتی محصول اور چنگی میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض روایتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض جگہ کے ذمیوں اور مسلمانوں میں عشور (چنگی) کی وصولی میں فرق کیا گیا ہے۔ مگر یہ کوئی اصولی چیز نہیں ہے۔ بعض علماء کے نزدیک تو عشور کی سرے سے کوئی شرعی حیثیت ہے ہی نہیں (گویا یہ سراسر ایک انتظامی شے ہے[۱])، اور جن کے نزدیک اس کی کوئی شرعی بنیاد ہے بھی وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ تجارتی عشور غیر مسلموں پر اسی

---

[۱] اس رائے کی رو سے اوّل تو یہ بات اس طرح صاف ہو جاتی ہے کہ اگر کسی وقت اسلامی حکومت نے ایسا کیا تو اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے بلکہ اس وقت کے حکومت چلانے والوں پر ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ فرق اس وجہ سے ہی کیا گیا ہو کہ وہ ذمی ہیں اور یہ مسلمان ہیں بلکہ اس فرق کے دوسرے بالکل جائز معاشی وجوہ بھی ہو سکتے ہیں۔

صورت میں لگائے جا سکتے ہیں جب اس بارہ میں ان سے خاص طور پر کوئی معاہدہ ہو چکا ہو ورنہ جزیہ کے سوا اور کوئی مطالبہ ان سے نہیں کیا جا سکتا۔[1]

۴۔ ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ عام شاہراہوں پر ذمیوں کو اپنے دوش بدوش چلنے کا موقع نہ دیں۔ اس بارے میں اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہوگا کہ ابن عباس، ابو امامہ، ابن محیرز، قاضی عیاض، علقمہ اور نخعی جیسے لوگ اس بات کے قائل ہیں۔ کہ مسلمان ذمیوں کو سلام کرنے میں پیشقدمی کر سکتے ہیں۔[2] ظاہر ہے کہ اس کے بعد کون باور کر سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جائے گی کہ وہ عام شاہراہوں پر غیر مسلموں کو اپنے دوش بدوش چلنے سے اس طرح روکیں جس طرح مدراس کے برہمن اچھوتوں کو روکتے ہیں۔

(۴)۔ ایک اور غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کو اسلامی تہذیب و معاشرت اور اسلامی حدود و حرام و حلال اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا یا نہیں مجبوراً مسلمانوں کے ذوق اور رجحان کی پیروی کرنی پڑے گی۔ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اسلامی حکومت میں ملکی قانون (Law of the Land) اسلامی قانون ہی ہوگا ـــــ اور ظاہر بات ہے کہ اگر ایسا نہیں ہوگا تو ریاست کے اسلامی ہونے کے سرے سے کوئی معنی ہی نہیں ہیں ـــــ مگر جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے ریاست یا اس کا قانون غیر مسلموں کے مذہب، تہذیب، تمدن، اور پرسنل لاء میں دخیل نہیں ہوں گے یہاں تک کہ شراب اور سور کا استعمال اسلام میں اگرچہ قطعاً ممنوع اور جرم ہے۔ مگر اسلامی حکومت غیر مسلموں کو اس سے نہیں روکے گی۔[3] البتہ جس طرح دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنی حدود کے اندر کسی ایسی چیز کو روا نہیں رکھ سکتی جو معاشرے کی اجتماعی زندگی کو ریاست کے بنیادی اصولوں کے خلاف متاثر کرنے والی ہو۔ اسی طرح اسلامی حکومت اپنی حدود کے اندر

---

[1] نیل الاوطار۔ جلد ۸، صفحہ ۵۲

[2] 〃 〃 〃 ۵۶

[3] کتاب الاموال، ابو عبید، صفحہ ۱۰۲

کسی کو بھی مثلاً اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ قحبہ گری یا سودی لین دین کا پیشہ کرے. اگرچہ یہ کسی شخص یا گروہ کے نزدیک جائز اور کارِ ثواب ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ ملک کی اجتماعی زندگی کے اخلاقی اور معاشی نظام کو بگاڑنے والی چیزیں ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم عورتوں کو اگرچہ پردے کی شرعی حدود کا قانوناً پابند نہیں کیا جائیگا لیکن بہرحال ان کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ مغرب زدہ عورتوں کی طرح لوگوں کے اخلاق بگاڑتی پھریں۔

پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم اور ان کے حقوق

اسلامی قانون نے معاہد اہل ذمہ اور مفتوح اہل ذمہ (اہل عَنوہ) میں جس نوعیت کا فرق کیا ہے اور جس بنا پر کیا ہے اس کو میں نے، جس حد تک غیر مسلموں سے متعلق مسائل سمجھنے کے لئے ضروری تھا، واضح کر دیا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر اب اس سوال پر غور کیجئے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ ان کی حیثیت معاہد اہل ذمہ کی قرار پائے گی یا ان کو مفتوح اہل ذمہ کے حکم میں رکھا جائے گا؟ اس سوال کا جواب متعین ہو جانے کے بعد ان کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کا فیصلہ کرنا نہایت آسان ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی شخص انکار کر سکے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کو مفتوح اہل ذمہ قرار دینے کے لئے کوئی معمولی سی وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ نہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کوئی جنگ کی ہے اور نہ حکومت پاکستان نے ان کو بزور شمشیر مغلوب کیا ہے۔ وہ تقسیم ہند کے لازمی نتیجہ کے طور پر پاکستان کے حصہ میں آئے ہیں اور اس تقسیم کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ دونوں قوموں کے ذمہ دار لیڈروں کے باہمی راضی نامہ سے ہوئی ہے، نہ کہ کسی جنگی فتح و تسخیر کے ذریعہ سے۔ اس وجہ سے تنہا یہی بات کہ یہ غیر مسلم ایک باہمی راضی نامہ کے تحت ہمارے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ اس امر کے لئے کافی ہے کہ ان کو مفتوح و مغلوب رعایا کے زمرہ میں نہ رکھا جائے بلکہ معاہد اہل ذمہ کے زمرہ میں رکھا جائے۔ لیکن یہاں یہی ایک وجہ

نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جو ان کے معاملہ میں قابل لحاظ ہیں اور جن کی بنا پر ان کا معاہد ہونا بالکل متعین اور طے ہو جاتا ہے ۔ مثلاً :-

(۱) یہ کہ ابتدا سے اب تک اس ملک کے تمام ذمہ دار لیڈر متفق اللفظ ہو کر ان کو اس بات کا یقین دلاتے رہے ہیں کہ وہ اس ملک کے اندر اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ نہ صرف یہ کہ منصفانہ سلوک کیا جائے گا ، بلکہ نہایت فیاضانہ سلوک کیا جائے گا ۔

(۲) یہ کہ تقسیم کے بعد اس ملک کا نظام چلانے کے لئے عارضی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو اپنایا گیا جس کی رو سے یہ غیر مسلم ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق اس میں محفوظ کئے گئے ہیں ۔

(۳) پھر اس ایکٹ ۱۹۳۵ء کی جگہ جو دستور زیر ترتیب ہے اُسے مرتب کرنے کے لئے جو دستور ساز اسمبلی بٹھائی گئی ہے اُس کے غیر مسلم ارکان پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کے نمائندے ہیں اور اسمبلی کے ارکان ہونے کی حیثیت سے ان کو بھی وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو اسمبلی کے مسلمان ارکین کو حاصل ہیں ۔

یہ ساری باتیں اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ یہاں کے غیر مسلموں نے اپنی آزاد مرضی سے ، اپنے مصالح کے تحت ، اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور پاکستان کے ارباب حل وعقد نے بحیثیت ایک اقلیت کے ان کے ساتھ معاملہ کرنے کی ذمہ داری لی ہے ۔ اس ذمہ داری اور اعتماد کا تقاضا ، اس ملک میں ایک لادینی جمہوری ریاست (Secular Democratic State) کے قیام کی صورت میں تو یہ ہوتا کہ اُن کو اُس مفہوم میں ایک اقلیت قرار دیا جاتا جو موجودہ زمانہ میں اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے اور ان کے لئے وہی حقوق پاکستان کی کتاب دستور میں درج کئے جاتے جو اس زمانہ کی لادینی ریاستیں اپنے دساتیر (Constitutions) میں بالعموم ضابطہ کے طور پر درج کر دیتی ہیں ، لیکن چونکہ برعظیم ہند کے مسلمانوں نے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا ہی اُس غرض سے تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسلوں

کو لادینیت کے اثرات سے بچا سکیں اس لئے جن غیر مسلموں نے پاکستان میں قیام کو اپنے لئے منتخب کیا انہوں نے یہ جانتے ہوئے ہی یہ انتخاب کیا کہ یہاں کا اجتماعی نظام بہر حال اسلامی ہی ہوگا اس لئے اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے۔ کہ ایک اسلامی نظام کے اندر ہم اُن وعدوں اور اعلانات سے کس طرح پوری ایمانداری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو ہم نے اِس ملک کے غیر مسلموں سے کئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک اسلامی نظام کے اندر اس طرح کے غیر مسلموں کی حیثیت جو پاکستان میں ہیں "معاہد اہل ذمہ" کی قرار پائے گی اور ان کی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس ملک کے آئندہ دستور میں ان کے حقوق کا تحفظ ہوگا۔

یہ سوال کہ ان کو کیا حقوق دیئے جائیں، اِس مضمون میں ہمارے طے کرنے کا نہیں ہے بلکہ مجلسِ دستور ساز کے اندر دونوں قوموں کے نمائندوں کے طے کرنے کا ہے۔ وہ جو کچھ طے کر لیں گے اگر اُس سے شریعت کے کسی اصول کی خلاف ورزی لازم نہ آرہی ہو تو اس پر اللہ کا اور اس کے رسول کا ذمہ قائم ہو جائے گا اور اسلامی حکومت کے لئے، اس کے بعد، اس میں نقضاً اصناً یا عملاً ایک شوشہ کے برابر بھی کمی کرنا جائز نہ ہوگا الا یہ کہ دوسرے فریق نے اپنی ذمہ داریوں میں سے کسی ذمہ داری کے اٹھانے سے انکار کر دیا ہو اور اس معاملہ میں اس پر حجت تمام کی جا چکی ہو۔ تاہم اگر ہم یہاں بالاجمال یہ بتا دیں کہ شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ بحیثیت معاہد اہل ذمہ کے معاملہ کرنے میں کس حد تک وسعت ہے تو شاید اس سے ان لوگوں کو کچھ مدد ملے جو اس وقت اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں چند اشارات کروں گا جن کو سامنے رکھ کر ان کے حقوق کے متعلق ایک ضابطہ بنایا جا سکتا ہے۔

خراج سے برأت اگر ان لوگوں کو خراج کی ادائیگی یا اس نام سے کوئی رقم ادا کرنے پر اعتراض ہو تو ان کو خراج سے بری کیا جا سکتا ہے۔ اور زمین کی پیداوار اور دوسری آمدنیوں پر ان سے بھی وہی صدقات وصول کئے جا سکتے ہیں جو مسلمانوں سے وصول کئے جائیں گے اس کے سوا کوئی اور مناسب شکل بھی، جو فریقین کے درمیان طے ہو جائے، اختیار کی جا سکتی ہے بشرطیکہ

وہ شکل شریعت کے خلاف نہ ہو اور اس کے اختیار کرنے میں بیت المال (State — Exchequer) کو خسارہ نہ ہو۔[1]

جزیہ سے برأت اگر ان لوگوں کو جزیہ کے نام سے کسی رقم کی ادائیگی یا نفس جزیہ ہی کی ادائیگی پر اعتراض ہو تو ملک کے دفاع کے سلسلہ میں ان پر جزیہ کے بجائے کسی دوسرے نام سے بھی ٹیکس لگایا جا سکتا ہے اور اگر وہ ملک کے دفاع میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ حصہ لینے کے لئے تیار ہوں تو انہیں جزیہ کی نوعیت کے کسی ٹیکس کی ادائیگی سے بالکل بری بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس آخر الذکر صورت میں اسلامی حکومت کے سامنے جو سوال قابل غور ہوگا وہ صرف یہ کہ آیا انہوں نے اپنے طرز عمل سے ملک کی وفاداری کا ایسا ثبوت دیا ہے۔ کہ دفاعی معاملات میں حکومت ان پر اعتماد کر سکے۔ اگر یہ صورت ہے تو ان کو ملک کے دفاع میں براہ راست حصہ لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور اس مقصد کے لئے ان کو فوج میں ذمہ داری کے عہدے دیئے جانے میں اصولاً کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ لیکن حکومت کے بنیادی مقصد کے تحت ان کو پالیسی کے تعین اور اسلامی جنگ کے اصول و ضوابط پر اثر انداز ہونے کا موقع کسی حال میں نہیں دیا جا سکتا۔[2]

---

[1] یہ اور اس کے علاوہ دوسری باتیں جو اس باب میں ناظرین کے سامنے آئیں گی ان کے دلائل اوپر گذر چکے ہیں اس وجہ سے ان کو یہاں نہیں دہراؤں گا۔ اگر کوئی ایسی بات ہوئی جس کے دلائل کی تفصیل اوپر نہیں کی جا سکی ہے تو اس کے ماخذ کا بقدر ضرورت یہاں پتہ دے دیا جائے گا۔ براہ کرم کوئی صاحب بغیر پورے مضمون کو بغور پڑھے ان نتائج بحث پر کوئی رائے نہ قائم فرمائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ فتنہ میں پڑیں گے۔

[2] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث میں اس سلسلہ کے ایک مستقل مضمون میں کروں گا لیکن ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکے اس وجہ سے مختصراً اتنا یہاں ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ فقہا کا ایک گروہ اسلامی جہاد میں غیر مسلموں کی شرکت کو جائز نہیں قرار دیتا لیکن ایک دوسرے گروہ کے نزدیک (اگلے صفحہ پر)

مذہبی آزادی ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو پوری آزادی دی جا سکتی ہے۔ پاکستان کے جن شہروں اور دیہاتوں میں وہ آباد ہیں وہاں ان کو جو مذہبی آزادی اب تک حاصل رہی ہے اس کو بدستور باقی رکھنے کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اس بارے میں ان پر وہی پابندیاں عاید ہوں گی جو ملک کے دوسرے شہریوں (مسلمانوں) پر ملک کے عام قانون کے تحت اس معاملے میں عاید کی جائیں۔

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) پہلے ان سے استعانت ناجائز تھی مگر بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی۔ یہ مذہب امام شافعی کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔ اہل بیت، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ کفار وفساق سے بسلسلہ جہاد استعانت میں کوئی ہرج نہیں ہے بشرطیکہ یہ لوگ اس سلسلہ میں اسلامی قوانین جنگ اور امام کے امرونہی (Discipline) کے پابند رکھے جا سکیں۔ ان لوگوں کا استدلال مختلف احادیث اور واقعات سے ہے جن کی تفصیل کے لئے یہاں موقع نہیں ہے۔

بعض علماء جن میں ہادویہ جیسے لوگ شامل ہیں کہتے ہیں کہ جہاں امام کے ساتھ مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت ہو کہ ان کے بل پر وہ اسلامی احکام و قوانین ان لوگوں کے اندر جاری کر سکے جن کے خلاف فوج کشی کی گئی ہے وہاں غیر مسلموں سے استعانت میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اور یہ امر اپنی جگہ پر طے شدہ ہے کہ اگر ذمی مسلمانوں کے ساتھ ملک کی مدافعت اور دوسرے جنگی اقدامات میں شریک ہوں گے تو ان کا جزیہ معاف کر دیا جائیگا۔ دہستان اور جرجان کے معاہدہ صلح میں ان مقامات کے باشندوں سے مسلمانوں کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ:۔

من استعنا به منكم فله جزاءه	تم میں سے جو لوگ ہمارے (مسلمانوں کے) ساتھ
على معونته عوضا من جزائه	دفاع اور ہجوم میں شریک ہوں گے ان کا اس کے
(الفاروق عمر - جلد ۲، صفحہ ۳۰۱)	عوض میں جزیہ معاف

اسی طرح الباب یا باب الابواب کے رئیس "شہر براز" نے جب مسلمانوں کے حملہ کی اطلاع پائی تو اسلامی فوج کے سپہ سالار عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو لکھا کہ:۔

انّی بازاء عدوّ کلب و امم مختلفة	میں آپ کے سخت دشمن اور مختلف قوموں کے

تہذیب و تمدن اور پرسنل لاء کی آزادی ـــــ ان چیزوں کے بارے میں بھی ان ساری آزادیوں کی ضمانت دی جاسکتی ہے جو انہیں اب تک کے ملکی قانون کے تحت حاصل رہی ہیں۔

شہری آزادیاں یعنی اظہار رائے و خیال، تبلیغ مذہب اور تنقید و اجتماع کی آزادی۔ ان سب چیزوں میں بھی ان کو وہی حقوق دئے جا سکتے ہیں جو ملکی قانون کے تحت اس ملک کے کسی دوسرے شہری کو حاصل ہوں گے۔

قانون سازی میں حصہ مطلق قانون سازی کا حق، ہر شخص کو معلوم ہے، اسلامی ریاست کے اندر کسی کو بھی حاصل نہیں ہوگا۔ نہ کسی مسلم کو نہ غیر مسلم کو۔ جن معاملات میں اللہ اور رسول کے احکام

(بقیہ حاشیہ پچھلا صفحہ) و لست انا من القبج ولا من الارمن فی شیئ و انکم قد غلبتم علی بلادی و امتی - فانا منکم و یدی مع ایدیکم و جزیتی الیکم والنصر لکم و القیام بما تحبون - فلا تذلونا بالجزیة فتوھنونا لعدوکم۔

بالمقابل ہوں اور قبچ اور ارمنوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ لوگ اب میرے ملک اور میری قوم پر غالب آچکے ہیں۔

اب میں آپ میں سے ایک شخص ہوں، میری قوت آپ کے ساتھ اور میرا جزیہ اور میری مدد آپ کے لئے ہے اور میرا فرض ہے کہ آپ جو کچھ پسند کریں اس کی تعمیل کروں۔ اس وجہ سے بہتر یہ ہے کہ آپ ہم پر جزیہ عاید کرکے ذلیل نہ کریں ورنہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہم آپ کے دشمن کے لئے کمزور ہو جائیں گے۔

عبدالرحمٰن نے شہر براز کی درخواست اس ترمیم کے ساتھ منظور کرلی کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں حصہ لینگے انکا جزیہ معاف کردیا جائیگا اور تصدیق کیلئے اپنے اس فیصلہ کو امیر عسکر سراقہ بن عمر کے پاس بھیجا۔ سراقہ نے اس کی اطلاع امیرالمؤمنین حضرت عمرؓ کو کی۔ انہوں نے اس کی اجازت دی اور اس کی تحسین فرمائی۔ (الفاروق عمر۔ جلد ۲ صفحہ ۱۵۴)

موجود ہوں گے، اسلامی حکومت ان معاملات میں ان کو بلا کم و کاست جاری کرے گی۔ جن معاملات میں کوئی صریح قانون موجود نہ ہوگا ان کے بارہ میں اللہ اور اس کے رسول کی شریعت میں درک رکھنے والوں اور حالات اور مصالح پر اسلامی نظر سے غور کرنے والوں کا یہ کام ہوگا کہ وہ بتائیں کہ ان میں اسلامی شریعت کے مزاج سے کیا بات قریب تر ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں غیر مسلم نہ کوئی مدد دے سکتے ہیں اور نہ انہیں اس کام میں شریک کرنے کے کوئی معنی ہیں۔ البتہ جن امور کا تعلق عام مصلحت یا عام انتظامی معاملات سے ہے ان میں غیر مسلموں کے مشوروں سے بھی حکومت اُسی طرح فائدہ اٹھائے گی جس طرح مسلمانوں کے مشوروں سے فائدہ اٹھائے گی۔ بلکہ ایسے امور سے متعلق قانون سازی کے معاملات میں انہیں شریک بھی کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں کو اس بات کا حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کی ایک ایسی اسمبلی بنالیں جو ان کے مذہبی اور تہذیبی اداروں کی نگرانی بھی کرے اور ان کے پرسنل لاء کے دائرہ کے اندر قانون سازی کے لئے سفارشات بھی مرتب کرے۔

ملازمتیں اور عہدے بجز اُن کلیدی مناصب (Key Posts) کے جن کا تعلق پالیسی کے تعین سے ہے یا وہ پالیسی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں یا جن سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لئے اسلام اور اسلامی قوانین کے علم و تفقہ کی ضرورت ہے، اسلامی حکومت کے ہر شعبہ میں غیر مسلموں کو ملازمتیں دی جا سکتی ہیں اور ہر درجہ کی ملازمتیں دی جا سکتی ہیں۔ ان مناصب کے علاوہ باقی ہر عہدہ اور ہر چھوٹی بڑی ملازمت کے لئے صرف قابلیت، وفاداری، امانت و دیانت اور حسن کارکردگی کے اوصاف ہی فیصلہ کن شرائط کی حیثیت رکھیں گے۔

روزگار اور کفاف کا ذمہ غیر مسلموں کے بے کاروں کے لئے روزگار مہیا کرنے کا اور ان کے معذوروں اور ان کے متعلقین کے لئے بیت المال سے ان کی ضرورت کے مطابق وظیفہ کا ذمہ لیا جا سکتا ہے۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ میرا مقصد یہاں غیر مسلموں کے تمام حقوق کی فہرست مرتب

کرنا نہیں ہے بلکہ ان چند موٹی موٹی اصولی باتوں کو بیان کرنا ہے، جن کے بارہ میں ذہنوں میں سوالات موجود ہیں۔ باقی رہیں وہ باتیں جن کا تعلق عام انسانی حقوق سے ہے اور جن کے احترام کا ہر شخص قائل ہے ان کے ذکر کرنے کی میں نے ضرورت نہیں سمجھی ہے۔ ناظرین اس خلا کو خود بھر لیں گے

میں پورے اطمینان قلب کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کے لئے ان حقوق کی ذمہ داری لی جا سکتی ہے۔ اور ایک مرتبہ ان کی ذمہ داری لے لینے کے بعد اپنے ایمان و اسلام اور اپنی عاقبت کو خراب کئے بغیر کوئی حکومت ان حقوق پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ عظیم ذمہ داری اٹھانے کے بعد بھی اس بات کا امکان ہے کہ ان حقوق پر دست درازی کی جائے ـــ تاریخ اس قسم کی افسوسناک مثالوں سے خالی نہیں ہے ـــ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کا وہ کونسا نظام ہے جو اپنے اندر کی اقلیتوں کو اس سے بڑھ کر حقوق دیتا ہے۔ اور اس سے بڑی ضمانت دیتا ہے۔ اور وہ کونسا نظام ہے۔ جن کی نسبت یہ اطمینان کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس میں ایک مرتبہ اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہو جانے کے بعد بس ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اگر فی الواقع اس قسم کا کوئی نظام موجود ہے تو ہم اقلیتوں کو اس بات پر کوئی ملامت نہیں کریں گے۔ کہ وہ اپنے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اُسی نظام کے لئے مطالبہ اور اصرار کریں۔ لیکن کیا فی الواقع کوئی ایسا نظام موجود ہے؟ کیا ایک لادینی جمہوری نظام کے قیام کی صورت میں وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ ان کے حقوق ہر قسم کی تاخت و تاراج سے محفوظ ہو گئے؟ کیا اگر کاغذ پر یہ بات لکھ دی جائے کہ پاکستان کے سارے ہندو اور مسلمان اور عیسائی وغیرہ ایک قوم ہیں تو اس لکھ دینے کی وجہ سے یہ ایک قوم بن جائیں گے؟ کیا اگر ہم ایک لادینی ریاست قائم کر کے کسی ہندو یا عیسائی کو نمائشی طور پر وزیر اعظم یا صدر جمہوریہ کی کرسی پر بٹھا دیں تو فی الواقع ہندو یا عیسائی اس ملک میں حکمران بن جائیں گے یا حکمرانوں کی صف میں آ جائیں گے؟ ان سارے سوالوں پر جذبات سے الگ ہو کر واقعات کی دنیا میں غور کرنا چاہئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ دھوکے آج کل عام ہیں۔ ہر جگہ دیئے بھی جا رہے ہیں اور ہر جگہ یہ کھائے بھی جا رہے ہیں۔

اور اگر طفل تسلی ہی مقصود ہے تو یہاں بھی اس قسم کی باتیں کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کی باتوں سے کیا فائدہ؟ ہم یہ نہیں چاہتے کہ اس قسم کی بہلا دے کی باتیں کی جائیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے غیر مسلم بھائی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ لادینی جمہوریتوں میں اقلیتوں کا جو حال ہوتا ہے اس کے لئے انہیں ماضی کی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے پڑوس کے ملکوں سے اس کے لئے بہت کچھ سبق آموز مواد آج آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں اور آئندہ بھی حاصل کر سکیں گے۔ ہم ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس ملک میں ان لوگوں کو آزما دیکھیں جو خدا اور رسول کے نام پر ان کے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں خدا کے نام پر ذمہ داری لینے کے بعد بھی بے وفائیاں ہوتی رہی ہیں۔ تاہم خدا کا نام تمام ضمانتوں سے بڑی ضمانت ہے اور اگر یہ نام بھی ہماری حفاظت نہ کر سکا اور ہم کو ظلم اور ناانصافی سے نہ روک سکا تو پھر کوئی چیز بھی نہ ہماری حفاظت کر سکتی ہے اور نہ ہم کو ظلم اور زیادتی سے روک سکتی ہے۔

رکھنے سے کتنی مدت اجتناب کرنا چاہئے، اس سوال کا انحصار جتنا اس کے داخلی حالات پر ہوتا ہے اُس سے کہیں زیادہ خارجی تقاضوں پر بھی ہوتا ہے۔ پھر داخلی اور خارجی تقاضوں میں توازن کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرتی ہے۔

جماعت اسلامی ابتدائی تیاری کے دور کو لمبا کرنا چاہتی تھی لیکن حالات نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے میدانِ کار میں طلب کر لیا ہے۔ ہمارے ماحول میں اسلامی اور غیر اسلامی فکر کے درمیان جو آویزش جیسی ویسی چلی آرہی تھی، وہ تقسیمِ ہند سے قبل ہی خاصی تیز ہو چکی تھی لیکن آزادی اور تقسیم کے بعد وہ معاً انتہائی اشتعال پر پہنچ گئی۔ اب جبکہ حالات بتا رہے تھے کہ اس کشمکش کا فیصلہ اِدھر یا اُدھر بہت جلد ہو جانے والا ہے، اور آزادی کے بعد کے ابتدائی ۵ سال (یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ سال) اسلام کے لئے بالکل فیصلہ کن ہیں تو جماعت اسلامی کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ ہمہ تن "عشق" بنے اور "بے خطر آتشِ نمرود" میں کود جائے۔ اس موقع پر عقل کو محوِ تماشائے لبِ بام چھوڑنے کے علاوہ کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں۔ تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی اہم موڑ مڑنے والی ہے اور اگر اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لئے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آڑے نہ آئے تو پھر یہ دریا الحاد (Secularism) کے رخ بہ جانے کے بعد جب کنارے کاٹتا ہوا اپنی گزرگاہ کو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کر چکے گا تو پھر اسے ایک نئی سمت میں موڑنا دنیا کا ایک محال کام ہوگا۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے اپنے ماحول، اپنی حریف طاقتوں، اپنے دور کی تاریخ، اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے "نہ میں جنبد نہ جنبد گل محمد" کا ڈھنگ اختیار نہیں کیا کہ چاہے تمدن و سیاست کی ساری بازی شاطرِ الحاد جیت جائے لیکن وہ ایک گوشے میں بیٹھے تعمیرِ سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلام دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اُس پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لئے آخری ہلّہ بول رہی ہوں تو ان لوگوں کی سیرتیں اور تقوٰی کس کام کا جو اپنی جانوں کو بچانے کے لئے گھروں کے دروازے بند کئے بیٹھے رہیں۔ جماعت اسلامی نے جس روز مطالبۂ نظام اسلامی کی تحریک شروع کر کے عوامی دور میں قدم رکھا ہے، حالات گواہ ہیں کہ یہ کام اُس روز سے موخر کرتا مہلک ہوتا

وقت کی پکار کو اگر ہم لوگ اس کان سن کر اس کان اڑا دیتے تو آج "قراردادِ مقاصد" میں جوہرِ اسلامیت کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا بلکہ یہ کھلم کھلا لادینی ریاست کی تعمیر کا ایک اسلام کش اعلان ہوتی اور آج ہماری مملکت کی گاڑی غیر اسلامی راستے پر نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہوتی۔

پس اب جبکہ ایک قدم اٹھ چکا ہے، اس کے واپس لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اب اسے آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ اب اس کارکن یا پیچھے ہٹنا ---- چاہے وہ تعمیرِ سیرت ہی کے لئے کیوں نہ ہو ---- ایک معرکۂ کشمکش سے فرار کی حیثیت رکھتا ہے، اور فرار ایک انقلابی تحریک کے لئے ہمیشہ موت ثابت ہوتا ہے۔ اس فرار کے بعد ایک جماعت محض مذہبی فرقہ یا سیاسی جتھا بن کے رہ جاتی ہے، وہ زمانے کی امامت نہیں کرسکتی۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک یہ ناگزیر ہے کہ تعمیرِ سیرت کے لئے جو کچھ بھی اہتمام کیا جائے وہ اس کشمکش کو جاری رکھتے ہوئے کیا جائے جو ایک فرض بن کر ہمارے اوپر لازم ہو چکی ہے۔

اب یہ ممکن نہیں ہے کہ عوامی معرکہ میں قدم رکھنے کے بعد ہم لوگ ان ذرائع و وسائل سے کام نہ لیں جو سیاست کے عوامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے جب ۴۸ء میں کراچی کی تقریر کے بعد یہ سوال کیا گیا کہ آپ مطالبے کو منوانے کے لئے کن طریقوں سے کام لیں گے تو موصوف نے صفائی سے یہ جواب دیا تھا کہ ہمیں اس کے لئے وہ سارے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے جو آپ نے مطالبۂ پاکستان کے لئے اختیار کئے تھے۔ (ان کے خلافِ اسلام پہلوؤں کا استثناء بہر حال اپنی جگہ پر مسلّم ہے)

اوپر کی گذارشات کا منشا صرف یہ ہے کہ اسلام کے ایک تحریک کی صورت میں ارتقاء کرتے ہوئے طبعی طور پر جو مراحل اسے پیش آ رہے ہیں اور آنے والے ہیں، ان کو ہمارے معترضین اور ہمارے خیر خواہ دونوں جامد مذہبیت اور مروجہ سیاست کی تفریق کی عینکوں سے نہ دیکھیں، اور قدم قدم پر [illegible] چھوڑ دیں۔

دماغوں کو بلند تر بنائیے، نگاہوں کو دور رسی کا درس دیجئے، سینوں کو فراخ کیجئے اور حوصلوں

کو عالی ظرفی کی صفت سے آراستہ کیجیے، یہاں تک کہ آپ پیش آمدہ مراحل کے تقاضوں ہی کو نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بتدریج پیش آنے والے احوال و مقامات کی ذمہ داریوں کو قبل از وقت سمجھ سکیں۔ آپ کو اپنے ملکی ماحول ہی کو نہیں، جہانی ماحول کو تفصیل سے سمجھنا چاہیے۔ آپ کی تاریخ کی سمتِ ارتقاء اور وقت کے بہاؤ کی رفتار کو جاننا چاہیے۔ آپ کو اسلام کی وسعتوں پر نگاہ رکھنی چاہیے، اس کے بغیر اسلام کی انقلابی تحریک کے ہر نئے مرحلے میں داخلے کے وقت آپ کو خواہ مخواہ کی الجھن ہوگی۔

خود ہمارے لئے یہ صورتِ حالات بہت ہی مضر نتائج رکھتی ہے کہ ہم اپنی ساری قوت صرف کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں، اور ہمارے معترضین سامنے سے آکر ہمارے لئے رکاوٹ بنیں اور ہمارے خیر خواہ پیچھے سے پکڑ کر ہمیں کھینچ رہے ہوں۔

معترضین سے تو ہم زیادہ توقعات وابستہ نہیں کر سکتے، البتہ اپنے خیر خواہوں سے ضرور یہ امید کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا تصریحات پر وہ خاص طور پر غور و فکر کر کے جماعت کی راہِ عمل کا ایک صحیح اندازہ قائم کریں گے کہ وہ کدھر سے ہو کر کدھر کو جاتی ہے۔ یہ حقیقت اگر ایک مرتبہ ذہن نشین ہو جائے تو پھر انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا کہ قدم قدم پر آپ اپنے اندر ایک ذہنی انتشار محسوس کریں اور ہر مرحلے پر ارشاد فرمائیں کہ "لقد جئت شیئاً اِمراً" (سورۂ کہف)